شرقِ اوسط کا المیہ

ابوالاعلیٰ مودودی

اسرائیل اور عرب ریاستوں کے درمیان چار دن کی جنگ کے جو ہولناک نتائج سامنے آئے ہیں وہ نہ صرف عربوں کی، بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں، بشرطیکہ ہمارے پاس عبرت پذیر دل، اور تجربات سے سبق سیکھنے والے دماغ موجود ہوں۔ اس جنگ میں اگر دوسری عرب ریاستوں کو شمار نہ کیا جائے جن کی مدد بروقت نہ پہنچ سکی تھی، تب بھی کم از کم چھ ریاستیں تو اپنی پوری طاقت کے ساتھ براہِ راست شریک تھیں۔ لیکن چار دن میں اسرائیل نے ان سب کو شکست دے دی۔ مصر سے غزّہ اور جزیرہ نمائے سینا کا پورا علاقہ چھین لیا۔ اردن سے فلسطین کا وہ علاقہ بھی جو ۱۹۴۹ء میں بچا رہ گیا تھا قدیم بیت المقدِس سمیت لے لیا۔ اور شام کو، جو صرف دس میل اسرائیلی علاقہ میں آگے بڑھ سکا تھا، اپنی سرحدوں سے پرے دھکیل دیا، یہاں تک کہ اسرائیل کے مقبوضات کا ایک انچ رقبہ بھی عربوں کے پاس نہ رہ سکا۔ اب اسرائیل کہتا ہے کہ شرقِ اوسط کا نقشہ نئے سرے سے بننا چاہیے اور جو علاقے اس نے فتح کیے ہیں وہ بیت المقدِس سمیت اس کے قبضے میں رہنے چاہییں۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟ اگر ہم آنکھیں بند کر کے تباہی کے گڑھے میں نہیں گرنا چاہتے تو ہمیں بے لاگ طریقے سے اس سارے معاملہ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے

اسرائیل کا وجود بجائے خود ایک مستقل جارحیت ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں صہیونی تحریک (ZIONIST MOVEMENT) شروع ہی اس جارحانہ مقصد کے ساتھ ہوئی تھی کہ دو ہزار برس پہلے یہودیوں کو جس سرزمین سے رومیوں نے نکالا تھا اسے وہ ہر ممکن تدبیر سے دوبارہ حاصل کریں۔ اس کا پہلا ہدف اگرچہ فلسطین تھا، مگر ان لوگوں کا آخری مقصد جس کو انہوں نے

کبھی چھپا کر نہیں رکھا، یہ تھا کہ دریائے نیل سے لے کر فرات تک، اور شمالی حجاز سے لے کر جس میں مدینہ طیبہ بھی شامل ہے، شام کی انتہائی شمالی سرحدوں تک، پورا علاقہ مسلمانوں سے چھین لیا جاتے اور اس علاقے میں دنیا بھر کے بکھرے ہوئے یہودیوں کو لا کر بسایا جائے۔ ۱۹۴۸ء میں فلسطین کے جس حصے پر اسرائیل کی ریاست قائم ہوئی، صیہونی تحریک کے علمبرداروں کی نگاہ میں وہ دراصل محض قدم رکھنے کی جگہ تھی۔ ان کا ہرگز یہ ارادہ نہ تھا کہ بس اسی علاقے کو وطنِ یہود بنانے پر اکتفا کریں گے۔ اوّل روز سے ان کے پیشِ نظر یہ تھا اور آج بھی وہ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر کام کر رہے ہیں کہ ہر موقع سے فائدہ اٹھا کر پھیلتے چلے جائیں یہاں تک کہ مصر سے ڈیلٹا کا علاقہ، سعودی عرب سے مدینہ طیبہ تک کا علاقہ، پورا اردن، پورا شام، پورا لبنان، ٹرکی سے اسکندرون کا علاقہ، اور عراق سے اس کے ملک کا بڑا حصہ چھین لیں۔ ان علاقوں کو وہ صرف اپنا مقبوضہ بنا کر مسلمانوں کو وہاں غلام کی حیثیت سے نہیں رکھنا چاہتے، بلکہ وہ ان کو فنا کر کے، یا ملک سے نکال باہر کر کے زمین خالی کرانا چاہتے ہیں، تاکہ یہودیوں کو لا کر اس جگہ بسایا جائے۔ اس مقصد میں پہلی کامیابی ان کو ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی جب فلسطین کے بڑے حصے پر ان کی ریاست قائم ہوئی۔ اس کے ۱۸ سال بعد اب انہیں یہ دوسری کامیابی حاصل ہوئی ہے جس میں باقی ماندہ فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا انہوں نے چھین لیا ہے۔ لیکن یہ صرف دوسرا قدم ہی ہے۔ عربوں اور مسلمانوں کی کمزوریوں کا جو نتیجہ اس چار دن کی جنگ میں سامنے آیا ہے، اس کے بعد یہ سمجھنے کے لیے کچھ بہت زیادہ دُور اندیشی کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ وہ مزید قدم اٹھانے میں کوئی تاخیر نہ کریں گے۔

اِس صیہونی تحریک کے معاملہ میں مغربی دنیا نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس کے تین بڑے محرکات ہیں جن کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے:

اوّل یہ کہ اس میں صلیبی جنگ کی روح (CRUSADE SPIRIT) کارفرما ہے۔ اسی وجہ سے سویڈن اور ڈنمارک سے لیکر کینیڈا تک پوری مغربی دنیا کھلم کھلا اسرائیل کی حمایت کر رہی ہے، اور اس مسئلے میں اُن کے درمیان وہی اتحاد پایا جاتا ہے جو قرونِ وسطیٰ کی صلیبی لڑائیوں میں پایا جاتا تھا۔

دوم یہ کہ اس معاملہ میں مغربی قوموں کی انتہائی شرمناک بداخلاقی، خودغرضی اور سنگدلی کام کرتی رہی ہے۔ پہلی جنگِ عظیم میں جرمنی کے خلاف یہودیوں کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لیے انگریزوں نے فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کا اعلان کیا۔ یہ گویا اُن کی خدمات کا معاوضہ دوسروں کی جیب سے ادا کروانا تھا۔ پھر دوسری جنگِ عظیم کے بعد جو یہودی ہٹلر کے قتلِ عام سے بچ کر مختلف ملکوں میں پناہ گزیں ہوئے اُن کو آباد کرنے کا یہ طریقہ نکالا گیا کہ صدیوں سے جو عرب فلسطین میں آباد تھے ان کو اکھاڑ کر اِن یہودیوں کو ان کی جگہ بسایا جائے۔ گویا ایک ظالم کے ظلم کی تلافی دوسرے بے گناہوں پر ظلم ڈھا کر کی گئی۔ اُن کے لیے آسٹریلیا، کینیڈا، امریکہ، ارجنٹائن، برازیل اور دوسرے بڑے بڑے ملکوں کے لاکھوں مربع میل خالی پڑے ہوئے رقبوں میں کوئی جگہ نہ تھی۔ ان بے گھروں کو جگہ دلوانے کی بس یہی ایک صورت تھی کہ آٹھ دس لاکھ عربوں کو مار مار کر ان کے گھروں سے نکالا جائے۔

سوم یہ کہ امریکہ پر خصوصیت کے ساتھ یہودی کچھ اس طرح چھا گیا ہے جیسے کسی آدمی پر جن سوار ہو جائے۔ امریکی پریس، خبررساں ایجنسیوں اور مالیات پر یہ قوم پوری طرح مسلط ہے۔ اور یہودی ووٹوں کی طاقت اتنی زبردست ہے کہ امریکہ کے صدر سے لے کر کانگریس کے ممبروں تک، سب اپنی سیاسی کامیابی کے لیے ان کے محتاج ہیں۔ اِن حالات میں اگر امریکہ کو یہودیوں کی خاطر تمام دنیا کے عربوں اور مسلمانوں کو قربان بھی کر دینا پڑے تو وہ اس کی کوئی پروا نہ کریگا۔

یہی وجوہ ہیں جن کی بنا پر اسرائیل کے روزِ پیدائش سے مغربی دنیا نے بالعموم اور امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے بالخصوص اُس کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بنانے کی کوشش کی ہے۔ ایک طرف تمام دنیا کے یہودیوں نے اس ریاست پر روپے کی بارش کی، یہاں تک کہ ایک اندازے کے مطابق اب تک اسے دس ارب روپیہ چندہ مل چکا ہے۔ دوسری طرف مغربی جرمنی سے اس کو چار ارب سے زیادہ رقم بطور تاوان دلوائی گئی۔ تیسری طرف امریکہ نے اسے تقریباً آٹھ ارب روپے کی مالی امداد دی اور اس پر مزید یہ کہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے مل کر جدید ترین ہتھیاروں سے اس کو اتنا مسلح کر دیا کہ وہ تمام عربوں کی متحدہ طاقت کو شکست دینے کے قابل ہو گیا۔ اس کی آبادی

۲۷ لاکھ سے زیادہ نہیں ہے، اور اس کے مقابلہ میں جو عرب ملک اس کے چاروں طرف واقع ہیں اُن کی آبادی ۵ کروڑ ہے۔ لیکن تازہ جنگ میں چار دن کے اندر لڑائی کے جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ یہ اندازہ کرنے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ پچھلے ۱۹ سال کے دوران میں ان مغربی ملکوں نے اُس کو کتنے بڑے پیمانے پر ہتھیار مہیا کیے ہیں۔ اِس سے بھی زیادہ صحیح اندازہ کرنے کے لیے ایک نگاہ ذرا پیچھے پلٹ کر دیکھنا چاہیے۔ مئی ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام کا اعلان ہونے پر مصر، اردن، عراق، لبنان اور شام نے اس کے خلاف جو جنگ برپا کی تھی وہ آٹھ مہینے تک چلتی رہی اور اس مدت میں یہودیوں نے عربوں سے لڑ کر فلسطین کا ۸ ہزار مربع میل علاقہ فتح کیا۔ لیکن ۱۹ سال کے بعد ان ریاستوں کی متحدہ طاقت سے اس کی لڑائی صرف چار دن چلی اور اس میں ۴۲ ہزار مربع میل کا علاقہ عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا جس کے اندر پورا جزیرہ نمائے سینا، غزہ، اور باقی ماندہ فلسطین شامل ہے۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ مغربی ملکوں نے اسرائیل کو بے تحاشا فوجی امداد دی ہے اور خوب سوچ سمجھ کر اس ارادے کے ساتھ دی ہے کہ اسے عربوں کی متحدہ طاقت کو شکست دینے کے قابل بنایا جائے۔ پھر معاملہ اسی حد تک نہیں رہا، بلکہ عین اِس جنگ سے پہلے بحرِ روم اور بحرِ احمر میں برطانیہ اور امریکہ کے کئی طیارہ بردار جہاز عربوں کے سر پر پہنچ گئے اور انھوں نے اسرائیل کی فضائی حفاظت کا کام اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی پوری ہوائی طاقت کو اس غرض کے لیے آزاد کر دیا کہ وہ عرب ملکوں اور ان کی فوجوں پر تاخت کرنے کے لیے وقف ہو جائے۔

اسرائیل کی کامیابی کے اہم اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اپنے قیام کے بعد سے اب تک پورے ۱۹ سال وہ ہر قسم کی داخلی کشمکش سے آزاد رہ کر اپنی تعمیر و ترقی کے کام میں لگا رہا ہے۔ اس پوری مدت میں وہاں کوئی انقلاب برپا نہیں ہوا۔ کسی پارٹی نے دوسری پارٹیوں کو فنا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کوئی ڈکٹیٹر قوم کا واحد نجات دہندہ بن کر نہیں اٹھا۔ کسی نے کسی کو غدار یا عربوں کا ایجنٹ یا کسی غیر طاقت کا تنخواہ دار قرار نہیں دیا۔ دنیا کے سو مختلف ملکوں سے یہودی سو مختلف زبانیں بولتے ہوئے وہاں آئے۔ ان کی عادات، روایات، رسوم، سب ایک دوسرے سے بے انتہا مختلف

تھیں۔ ان کے درمیان یہودیت کے سوا کوئی چیز مشترک نہ تھی اور مذہبی حیثیت سے بھی وہ یہودیت کے بہت سے مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ سیاسی اعتبار سے بھی ان کے درمیان متعدد پارٹیاں اپنے اپنے مختلف نظریات اور پروگرام رکھتی تھیں، اور معاشی حیثیت سے بھی ان کے درمیان مفادات کا اچھا خاصا تصادم موجود تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ مل جُل کر پورے امن کے ساتھ ایک جمہوری نظام چلاتے رہے، اور انتخابات کے ذریعہ سے بڑی سہولت کے ساتھ یہ فیصلہ کرتے رہے کہ کس وقت کس پارٹی کو اکثریت کا اعتماد حاصل ہے جسے ملک کا نظم و نسق چلانا چاہیے۔ ۱۹۶۵ء میں بن گوریان جیسے مقبولِ عام قومی لیڈر کی پارٹی کو موجودہ وزیر اعظم اشکول کی پارٹی نے انتخابات میں شکست دی اور بلا کسی مزاحمت کے اقتدار اس کی طرف منتقل ہوگیا۔ تازہ جنگ سے ذرا پہلے اشکول نے دوسری پارٹیوں کو ساتھ ملا کر متحدہ قومی کابینہ بنائی اور جنرل موشے دایان کو وزیر جنگ کا منصب سپرد کر دیا، حالانکہ وہ اس کا سیاسی رقیب اور بن گوریان کی پارٹی کا نمایاں ترین فرد ہے اور اشکول کے خلاف نہایت تلخ تنقیدیں کرتا رہا ہے۔ باہمی تعاون کی اس پُر امن فضا میں اسرائیل نے پچھلے ۱۹ سال کے دوران میں اپنی صنعت، زراعت، اور تجارت کو غیر معمولی ترقی دی اپنے معیارِ زندگی کو مغربی یورپ کے معیار تک پہنچا دیا۔ ایشیا اور افریقہ میں اپنے معاشی تعلقات اور سیاسی اثرات کو بڑے پیمانے پر وسیع کیا اور دنیا کی رائے عام پر نہ صرف اپنی بلکہ پوری یہودی قوم کی دھاک بٹھا دی۔

اس ساری مدت میں ہمارے ہاں جو کچھ ہوتا رہا اس کی داستان بیان کرنے کی آخر کیا حاجت ہے؟ متعدد عرب ممالک پے درپے جن انقلابات سے دوچار ہوتے رہے، جس طرح ان کی طاقتیں آپس ہی میں ایک دوسرے کے خلاف صرف ہوتی رہیں، جس طرح اُنہوں نے ایک دوسرے کی حکومتوں کے تختے الٹنے کی کوششیں کیں، اور جس طرح وہ ایک دوسرے کو بدنام کرنے کے لیے گندے اور زہریلے پروپیگنڈے کرتے رہے، ساری دنیا اس کا تماشا دیکھتی رہی ہے۔ دشمن اس پر ہنستے رہے ہیں، اور مسلمان اس پر خون کے آنسو روتے رہے ہیں۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ عین اُس وقت جبکہ اُن کی آنکھوں کے سامنے دشمن اپنے سارے اختلافات کو نظر انداز کر کے یہودیت

پر مجتمع ہو رہے تھے، اور جبکہ دنیا بھر کے مسیحی ان یہودیوں کو حضرت عیسیٰ کا خون معاف کر کے ان کی حمایت کا بیڑا اٹھا رہے تھے، بعض عرب ملکوں میں خود اپنے بھائیوں کے خلاف عقائد اور نظریات کی جنگ برپا کر دی گئی اور اُس کا سلسلہ دشمن کے حملے کا خطرہ سر پر منڈلاتے دیکھ کر بھی نہ رُکا۔

جنگ کا آغاز ہونے سے دو چار روز پہلے فوری طور پر عرب ریاستوں کے درمیان اتحاد کی جو شکل پیدا ہوئی، وہ جیسی کچھ مؤثر اور مفید ہو سکتی تھی اس کا اندازہ ہر شخص خود کر سکتا ہے۔ جنگ شروع ہونے تک بھی اس خیال کی مزاحمت کی جاتی رہی کہ عرب سربراہ ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے مقابلہ کے لیے کوئی متفقہ منصوبہ بنائیں۔

مغربی طاقتوں نے ۱۹۵۵ء سے ہی عربوں کو اس بات سے مایوس کر دیا تھا کہ وہ اپنی فوجی طاقت مضبوط کرنے کے لیے ان کے ہاں سے ہتھیار پا سکیں گے۔ بعض عرب ریاستوں کو اگر امریکہ، برطانیہ، یا فرانس سے کچھ ہتھیار ملے بھی تو بہت ناپ تول کر انتہائی بخل کے ساتھ ملے۔ اس حالت میں بیشتر عرب ملک اس بات کے لیے مجبور ہو گئے کہ ہتھیار حاصل کرنے کے لیے روس اور دوسرے اشتراکی ملکوں کی طرف رجوع کریں۔ علاوہ بریں وہ روس ہی تھا جس کی مداخلت سے ۱۹۵۶ء میں مصر کو برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کے مشترکہ حملہ سے نجات نصیب ہوئی تھی۔ اِن وجوہ سے عرب ممالک میں ایک طرف سوشلزم کا زور بڑھتا چلا گیا اور دوسری طرف وہ زیادہ سے زیادہ روس کی مدد پر انحصار کرنے چلے گئے۔ تازہ جنگ کے موقع پر عربوں کو پُورا اعتماد تھا کہ اگر امریکہ اور برطانیہ نے اسرائیل کی حمایت کی تو رُوس اُن کی مدد کے لیے آجائے گا۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ روس کی مداخلت کا خوف اِن دونوں مغربی طاقتوں کو جنگ میں اسرائیل کی مدد کرنے سے باز رکھے گا اور تنہا اسرائیل سے اگر ان کی متحدہ طاقت کا مقابلہ ہو تو وہ بآسانی اس کو شکست دے سکیں گے۔ لیکن ان کے یہ اندازے بالکل غلط تھے اور جنگ کے موقع پر اُن کا غلط ہونا پوری طرح ثابت ہو گیا۔ جو لوگ حالات پر نگاہ رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس وقت سے کیوبا کے معاملہ میں روس نے امریکہ کے مقابلے میں مونچھیں نیچی کی ہیں، رُوس کی طاقت کا بھرم ختم ہو چکا ہے اور یہ امر اب یقینی

ہے کہ جس معاملہ میں امریکہ لڑنے کا عزم لے کر آگے بڑھے گا اس میں روس کبھی مقابلے پر نہ آئے گا۔ عرب سیاست دانوں کو یہ غلط فہمی لاحق رہی کہ حالات اب بھی وہی ہیں جو ۱۹۵۶ء میں تھے حالانکہ وہ بالکل بدل چکے ہیں۔ اب انہوں نے خود دیکھ لیا کہ امریکہ اور برطانیہ نے کھلم کھلا اسرائیل کی مدد کی، اور روس بس دُور سے دھمکیاں دیتا رہا، بلکہ سلامتی کونسل میں وہ جنگ بندی کے لیے ٹھیک وہی قرارداد لے آیا جو اسرائیل کے مفاد میں تھی نہ کہ عربوں کے مفاد میں۔

عرب لیڈروں کو برسوں سے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ جس خطرے سے وہ دوچار ہیں اس کا مقابلہ تنہا عرب قومیت نہیں کر سکتی بلکہ اس کے لیے تمام دنیا کے مسلمانوں کی متحدہ طاقت درکار ہے۔ فلسطین کا مسئلہ محض عربوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ پُورے عالمِ اسلامی کا مسئلہ ہے۔ عرب ریاستیں اگر غیر عرب ریاستوں سے الگ اپنی ایک مستقل حیثیت اختیار کریں، اور پھر آپس میں بھی وہ اس طرح بٹ جائیں کہ کسی کا تعلق مشرقی بلاک سے ہو اور کسی کا مغربی بلاک سے، تو اس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ لیکن ان باتوں کو انہوں نے کبھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ اسلام کی بنیاد پر اتحاد کے تصور کی وہ مزاحمت کرتے رہے۔ اور خود عربوں کے درمیان سوشلسٹ اور غیر سوشلسٹ، ترقی پسند اور رجعت پسند، انقلابی اور غیر انقلابی کی تفریق کر کے انہوں نے کوئی متحدہ عربی طاقت بھی نہ بننے دی۔ ان کی سیاست کے تین ستون تھے جن پر وہ آج تک اپنے سارے منصوبوں کی بنا رکھتے رہے ہیں۔ ایک عرب قومیت، دوسرے اشتراکی نظام، تیسرے رُوس اور اشتراکی بلاک کی حمایت پر اعتماد۔ موجودہ جنگ نے ان تینوں ستونوں کو مسمار کر کے رکھ دیا ہے اور اب صرف وہی شخص ان پر از سر نو کسی پالیسی کی بنا رکھ سکتا ہے جو تجربات سے سبق سیکھنے کی کوئی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ کاش اب بھی یہ بات ان کی سمجھ میں آجائے کہ نجات کا راستہ صرف اسلام ہے۔ ان کے حقیقی دردمند و خیر خواہ دنیا میں صرف مسلمان ہی ہو سکتے ہیں۔ اور غیروں پر اعتماد کرنے کے بجائے انہیں خدا کے بھروسہ پر عالم اسلامی کی ایک متحدہ طاقت بنانی چاہیے۔

اب فوری توجہ طلب مسئلہ یہ ہے کہ اُن اثرات و نتائج کا مقابلہ کیا جائے جو اس جنگ میں

اسرائیل کی کامیابیوں سے رونما ہوئے ہیں اور جن کے آئندہ رونما ہونے کا خطرہ ہے۔ اسرائیل نے قدیم بیت المقدس پر قبضہ کر لیا ہے، اور وہ کھلم کھلا کہہ رہا ہے کہ یہ شہر جس میں ایک یہودی بھی موجود نہ تھا، اب اس بنا پر اُس کے قبضے میں رہنا چاہیے کہ اُس نے لڑ کر اسے حاصل کیا ہے۔ وہ پُورے باقی ماندہ فلسطین پر قابض ہو گیا ہے جہاں ایک یہودی بھی نہ تھا اور دس لاکھ مسلمان آباد تھے۔ اب وہ مار مار کر مسلمانوں کو وہاں سے نکال رہا ہے اور ان کی جگہ یہودیوں کو لا کر بسا رہا ہے۔ اُس کے وزیر اعظم، وزیر خارجہ اور وزیر دفاع علانیہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے جو علاقے فتح کیے ہیں انہیں ہم واپس نہیں کریں گے۔ اس طرح وہ دنیا میں پھر ایک مرتبہ یہ قاعدہ نافذ کروانا چاہتا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم سے لڑ کر اگر اس کا ملک فتح کرلے تو وہ حقِ فتح کی بنا پر اس کی مالک بن جائے گی۔ اقوامِ متحدہ کے منشور کی یہ کھلی خلاف ورزی ہے جو وہ کرنا چاہتا ہے، اور امریکہ و برطانیہ نے اس کے مقابلے میں بالکل چپ سادھ رکھی ہے۔ اس مقصد میں اگر اسرائیل کامیاب ہو جائے تو معاملہ صرف فلسطین اور سینا پر ختم نہ ہوگا بلکہ مزید قدم وہ اردن، شام، مصر اور سعودی عرب کی طرف بڑھائے گا اور اسی قاعدے کو وہاں بھی نافذ کیا جائے گا کہ جو جو علاقے وہ لڑ کر حاصل کرتا جائے وہ اس کی ملکیت بنتے جائیں۔ اور جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، اس کی فتوحات کے معنی صرف اتنے ہی نہیں ہیں کہ ایک ملک پر وہ قابض ہو جائے، بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ اس ملک کے اصل باشندوں کو فنا کر کے یا جلاوطن کر کے ان سے زمین خالی کرائے اور ان کی جگہ دنیا بھر سے یہودیوں کو لا کر بسائے۔

ان خطرات کا مقابلہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ تمام مسلمان حکومتیں اس وقت پُورے عزم اور پُورے اتفاق کے ساتھ آگے بڑھ کر عرب ریاستوں کا ساتھ دیں، اور دنیا کی تمام دوسری انصاف پسند حکومتوں کی تائید بھی اِس ایک اصولی بات کو تسلیم کرانے میں صرف کر دیں کہ کسی جنگی کارروائی کے ذریعہ سے ایک قوم کو دوسری قوم کے ملک پر قبضہ کرنے اور تلوار کے زور سے سرحدوں میں تغیر و تبدل کرانے کا حق نہیں ہے۔ اس معاملے میں اگر مسلمان حکومتوں نے ذرّہ برابر بھی غفلت کی تو اس کا بہت بڑا خمیازہ ایک نہ ایک وقت ہم سب کو بھگتنا پڑے گا۔

مگر ہمیں اس فوری مسئلے کے علاج کی فکر پر اکتفا نہ کرنا چاہیے بلکہ آگے کے لیے کوئی مستقل لائحہ عمل بھی اختیار کرنا چاہیے جو اس ہزیمت کے دُور رس اثرات اور اس کے بنیادی اسباب کا تدارک کر سکے۔ اس جنگ کو خواہ کوئی عرب اور یہود کی جنگ کہے اور اس میں عربوں کی ہزیمت کو صرف عربوں ہی کی ہزیمت قرار دے، مگر فی الحقیقت اس نے تمام دنیا کے مسلمانوں کی عزت، ان کے وقار، اور ان کی سلامتی کو صدمہ پہنچایا ہے۔ اس میں بیت المَقدِس پر یہودیوں کا تسلط اور مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کا خطرہ صرف عربوں ہی پر نہیں، دنیا بھر کے مسلمانوں پر ایک کاری ضرب ہے جس کی ٹیس کو ہر مومن اپنے دل میں محسوس کرتا ہے، کیونکہ بیت المقدس صرف عربوں ہی کا نہیں، سارے ہی مسلمانوں کا قبلۂ اوّل ہے۔ پھر یہ بھی صاف نظر آرہا ہے کہ اب یہودیوں کے جارحانہ توسیعی عزائم حرمین شریفین کا رُخ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ سب سے بڑا خطرہ ہے جو تنہا عربوں کے لیے ہی نہیں، دنیا کے ہر مسلمان کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ ان وجوہ سے اب وقت آ گیا ہے کہ دنیا کی تمام مسلمان حکومتیں اسرائیل کے مسئلے سے براہِ راست دلچسپی لیں۔ عرب قومیت کے علمبرداروں نے ۲۰ سال تک اسے صرف اپنا مسئلہ بنائے رکھا اور غیر عرب مسلمان بھی مطمئن رہے کہ وہ اس سے خود نمٹ لیں گے۔ لیکن اب ایک طرف یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ اس سے نمٹنے میں ناکام رہے ہیں، اور دوسری طرف ان کی ناکامی کا خمیازہ صرف وہی نہیں بلکہ سارے مسلمان بھگت رہے ہیں۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ آئندہ بھی یہ مسئلہ تنہا انہی کے ہاتھوں میں رہنے دیا جائے اور غیر عرب مسلمان خدانخواستہ ان کی تیسری ہزیمت کا عظیم تر خمیازہ بھگتنے کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔

ہمارے نزدیک اس مقصد کے لیے مناسب یہ ہے کہ پہلے غیر عرب مسلم ریاستیں باہم تبادلۂ خیال کر کے خود اپنے درمیان اس امر پر اتفاق کریں کہ انہیں سرسری طور پر نہیں بلکہ پوری سرگرمی کے ساتھ اس مسئلے سے دلچسپی لینی ہے۔ اس کے بعد انہیں عرب ریاستوں سے بات چیت کر کے انہیں اس بات پر آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ تمام مسلم ریاستوں کے سربراہوں کی ایک کانفرنس میں شرکت

کے لیے تیار رہوں۔ ہمیں امید ہے کہ بحالاتِ موجودہ وہ سب اس تجویز کو بتأمّل یا بلا تأمّل قبول کر لیں گی۔ تاہم اگر ان میں سے کوئی اسے قبول نہ بھی کرے تو اس کے لیے دروازہ کھلا رکھ کر ایسی کانفرنس اس کی شرکت کے بغیر ہی جلدی سے منعقد ہونی چاہیے۔ اس میں جن امور کی طرف خاص طور پر توجہ کی جانی چاہیے وہ یہ ہیں:

۱۔ مسلم معاشرے میں عقائد و نظریات کی جنگ برپا کرنا اور اسے اس حد تک بڑھانا کہ ایک نظریے کے حامی دوسرے نظریات کے حامیوں کو طاقت سے کچلنے پر تُل جائیں، سخت خطرناک حرکت ہے۔ اس کا ارتکاب عام حالات میں بھی نہ ہونا چاہیے، کجا کہ یہ عین اس حالت میں کیا جائے جبکہ دشمن دروازے پر دستک دے رہا ہو۔ اس کا فائدہ کسی نظریے کے حامیوں کو بھی نہیں پہنچ سکتا بلکہ آخرکار صرف دشمن ہی اس سے مستفید ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے کو تمام مسلمان ریاستوں میں قطعی طور پر بند ہونا چاہیے اور یہ بات اصولی طور پر طے ہو جانی چاہیے کہ جس نظریے کے حامی بھی کسی وقت برسرِ اقتدار ہوں وہ نہ اپنا نظریہ دوسروں پر زبردستی مسلط کرنے کی کوشش کریں گے اور نہ دوسرے نظریات کے حامیوں کو سیدھے سیدھے جمہوری و آئینی طریقوں پر کام کرنے سے روکیں گے۔

۲۔ مسلم ریاستوں کا باہم ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈا کرنا، یا ایک دوسرے کے ملک میں اندرونی انقلاب برپا کرنے کی کوششیں کرنا، یا ایک ریاست کا دوسری ریاست کے معاملات میں سیاسی یا فوجی مداخلت کرنا بھی قطعاً ممنوع ہونا چاہیے۔ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ اس کا فائدہ بھی آخرکار دشمن ہی کو پہنچتا ہے۔

۳۔ اس حقیقت کو خلوصِ دل کے ساتھ تسلیم کیا جانا چاہیے کہ مسلمانوں کی اصل طاقت اسلام اور اس کے لیے جہاد کا جذبہ ہے۔ کوئی نیشنلزم یا سوشلزم یا سیکولرزم مسلمانوں میں نہ زندگی کی طاقت پیدا کر سکتا ہے، نہ مسلم عوام میں رُوحِ جہاد اُبھار سکتا ہے۔ اِن نظریات کو باہر سے درآمد کر کے مسلم معاشرے میں رائج کرنے اور اس کے لیے حکومت کے ذرائع استعمال کرنے کا

حاصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مسلمانوں میں پرانے مذہبی تفرقوں پر چند نئے تفرقوں کا اضافہ کیا جائے، ان کی طاقتوں کو آپس کی کشمکش میں ضائع کیا جائے، اور پھر کسی جنگ کے موقع پر دشمن سے ہزیمت اٹھا کر اس کا خمیازہ بھگتا جائے۔ ان نظریات کو اختیار کرنے کا ایک مہلک نتیجہ یہ بھی ہے کہ یہ مسلمانوں کو اسلامی اخوت پر جمع ہونے سے روکتے ہیں اور ان کو متفرق طور پر اپنے اپنے قومی مفاد یا نظریاتی لگاؤ کی بنیاد پر دنیا کے متحارب بین الاقوامی جتھوں میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستہ کر دیتے ہیں، درانحالیکہ ان جتھوں میں سے کوئی بھی ان کے برے وقت پر کام آنے والا نہیں ہے، جیسا کہ حالیہ جنگ نے ثابت کر دیا ہے۔ اس لیے اب مسلمان مملکتوں کو یکسو ہو کر اسلام اور اسلامی اخوت پر جمع ہو جانا چاہیے۔

۴۔ مسلمان ریاستوں کو اپنی ایک بین الاقوامی عدالت وجود میں لانی چاہیے تاکہ وہ بروقت ان کی باہمی نزاعات کا تصفیہ کرے، اور ایک معاہدے کے ذریعہ سے سب کو اس بات کی پابندی قبول کرنی چاہیے کہ وہ اس عدالت کے فیصلوں پر عملدرآمد کریں گی۔

۵۔ ان کو اپنا ایک بین الاقوامی مانیٹری فنڈ قائم کرنا چاہیے جس میں وہ سب اپنے مالی وسائل کو مجتمع کریں اور مغربی یا مشرقی بلاک کی مالی امداد سے بے نیاز ہونے کی کوشش کریں۔

۶۔ ان کو باہم معاشی تعاون کے لیے بھی کوئی ایسا نقشہ بنانا چاہیے جس سے ان کے وسیع ذرائع و وسائل ان کی مجموعی ترقی کے لیے استعمال ہو سکیں، ان کی صنعت و تجارت فروغ پا سکے، اور ان کی معاشی قوت مستحکم ہو سکے۔

۷۔ ان کو جلدی سے جلدی اپنی ایک بین الاقوامی خبر رساں ایجنسی قائم کرنی چاہیے جو مسلمان ملکوں کو ایک دوسرے کے حالات سے بروقت آگاہ کر سکے۔ بحالاتِ موجودہ ہمیں خود مسلمان ملکوں کے حالات اُن خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں جو سیاسی ہی نہیں، مذہبی تعصبات کی بنا پر بھی ہمیں غلط معلومات دیتی ہیں اور صحیح حالات پر پردہ ڈالتی ہیں۔ ان میں سے اکثر ایجنسیوں پر یہودیوں کا غلبہ ہے اور وہ ان کے ذریعہ

سے علانیہ صہیونی پروپگنڈا کرتے ہیں۔

۸۔ ان کو اسلحہ کے معاملہ میں دوسروں کی محتاجی سے چھٹکارا پانے کی بلا تاخیر کوشش کرنی چاہیے۔ دنیا میں کہیں سے اگر ہتھیار بلا شرط خریدے جا سکتے ہوں تو وہ ضرور لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ہمارا کلی انحصار دوسروں پر نہ ہونا چاہیے کہ وہ جو کچھ دیں، اور جن ظاہری و باطنی شرائط کے ساتھ دیں، اور جو فائدہ بھی وہ ضمناً اپنی اس عنایت کے ذریعہ سے حاصل کریں، ہم بہر حال انہیں قبول کرنے پر مجبور رہیں۔ یہ صورتِ حال جب تک برقرار رہے گی، کوئی مسلمان ریاست بھی اپنی سالمیت کا تحفظ اپنے بل بوتے پر نہ کر سکے گی۔

۹۔ ان کے مدبرین اور فوجی ماہرین کو پورے غور و خوض کے ساتھ دفاع کا ایک جامع منصوبہ بنانا چاہیے اور کسی ایک طاقت کے ہاتھ میں یہ فیصلہ نہ چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ کسی وقت بطورِ خود ایسے اقدامات کر بیٹھے جن کے بُرے نتائج کم و بیش سب کو بھگتنے پڑ جائیں۔

یہ وہ کم سے کم امور ہیں جن کے لیے مسلمان ریاستوں کے سربراہوں کا اجتماع وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اور یہ صرف ہمارا ہی احساس نہیں ہے بلکہ باہر کے مسلمان اہلِ فکر بھی یہ رائے رکھتے ہیں کہ اِس وقت مسلمان ملکوں میں سے اگر کوئی ملک اس معاملہ میں پیش قدمی کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے تو وہ پاکستان ہی ہے۔ خدا کے فضل سے عرب ریاستیں بھی اس کو اپنا سب سے زیادہ ہمدرد و خیر خواہ سمجھتی ہیں، اور غیر عرب ریاستوں میں بھی وہی سب سے زیادہ ان سے قریب تر ہے۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کی رہنمائی فرمائے اور ان کو صحیح کام کرنے کی توفیق بخشے اور دشمنوں کے اس ہجوم میں ان کو اُن کے حال پر نہ چھوڑ دے۔

[اس مقالہ کا صرف ابتدائی حصہ ملک کے اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ پورا مقالہ ان صفحات میں درج کیا گیا ہے]